خواہش گویا نیم جان ہو رہی تھیں۔ نسیم کے ان ٹھنڈے جھونکوں نے انہیں بیدار کر دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ یہ مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے کوئی عہدہ مل جائے گا۔ تب وہ جا کر جالپا کو منا لائے گا اور زندگی سے لطف اندوز ہوگا۔ وہاں ایک نئی زندگی ہوگی۔ اس کے اصول کچھ اور ہوں گے۔ معیار کچھ اور ہوں گے۔ اس میں سخت پابندیاں ہوں گی اور بیدردانہ بندشیں۔ اب اس کی زندگی کا کچھ مقصد ہوگا۔ کچھ نصب العین ہوگا۔ محض کھانا سونا اور روپے کے لیے ہائے ہائے کرنا ہی مآل زندگی نہ ہوگا۔ اسی مقصد کے ساتھ اس بے اصولانہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نفس کی گمراہیوں نے اسے یہ دن دکھایا تھا اور اب تک نئی بے لوث زندگی کا خواب دکھا رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح ایسے شخص بھی روز ہی پاک ارادے کرتے ہیں، لیکن ان ارادوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ نئی نئی ترغیبیں سامنے آتی رہتی ہیں اور آغاز اصلاح کی میعاد ٹلتی جاتی ہے۔ نئی سحر کا طلوع کبھی نہیں ہوتا۔

ایک مہینہ دیہات کی سیر کرنے کے بعد رما اپنے ناز برداروں کے ساتھ اپنے بنگلہ پر جا رہا تھا۔ راستہ دیبی دین کے گھر کے سامنے سے تھا۔ کچھ دور ہی سے اپنا کمرہ دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں خواہ مخواہ اوپر اٹھ گئیں۔ کھڑکی کے سامنے کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سوچا اس وقت دیبی دین وہاں کیا کر رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو یہ کوئی عورت معلوم دیتی ہے، مگر عورت کہاں سے آئی تو اس عورت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ رما چونک پڑا۔ یہ تو جالپا ہے۔ بیشک جالپا ہے، مگر نہیں جالپا یہاں کیسے آ رہے گی۔ میرا پتا ٹھکانا اسے کہاں معلوم۔ کہیں بڈھے نے اسے خط تو نہیں لکھ دیا، ہے تو جالپا ہی۔ نائب داروغہ موٹر چلا رہا تھا۔ رما نے بڑی منت کے ساتھ کہا:

''سردار صاحب ایک لمحہ کے لیے رک جائیے۔ میں ذرا دیبی دین سے ایک بات کرلوں۔'' نائب نے موٹر دھیمی کرلی، لیکن پھر سوچ کر اسے آگے بڑھا دیا۔ رما نے تیز ہو کر کہا ''آپ تو مجھے قیدی سمجھ رہے ہیں۔''

نائب نے خفیف ہو کر کہا ''آپ تو جانتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کتنے جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔'' بنگلہ پر پہنچ کر رما سوچنے لگا کہ جالپا سے کیسے ملوں؟ وہ جالپا ہی تھی۔ اس میں اسے کچھ ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ آنکھوں کو کیسے دھوکہ دیتا۔ دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ کیا کرے، کیسے جائے، اسے کپڑے اتارنے کی یاد بھی نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک وہ کمرے کے دروازہ پر کھڑا رہا۔ کوئی حکمت نہ سوجھی۔ اچار پلنگ پر لیٹ گیا۔

ذرا دیر میں وہ پھر اٹھا اور سامنے صحن میں نکل آیا۔ پھاٹک پر چوکیدار کھڑا تھا۔ سڑک پر اسی وقت بجلی روشن ہوگئی۔ رما کو چوکیدار پر ایسا غصہ آیا کہ گولی مار دے۔ سوچنے لگا اگر مجھے کوئی اچھی جگہ مل گئی تو ایک ایک سے سمجھوں گا۔ تمہیں تو ڈمس کرا کے چھوڑوں گا۔ کیسا شیطان کی طرح سر پر سوار ہے۔ منہ تو ذرا دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے بکری کی دم ہے۔ واہ رے آپ کی پگڑی۔ کوئی نوکری ڈھونے والا قلی ہے۔ ابھی کتا بھونک پڑے تو دم دبا کر بھاگیں گے، مگر یہاں ایسے ڈٹے کھڑے ہیں گویا کسی قلعہ کے دروازے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ایک چوکیدار نے آ کر کہا: ''انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ باجے کے کچھ نئے توے منگوائے ہیں۔''

رما نے جھلا کر کہا: ''مجھے فرصت نہیں ہے۔'' پھر سوچنے لگا، جالپا اس وقت

یہاں کیسے آئی۔ اکیلی آئی ہے اور کوئی ساتھ ہے۔ ظالم نے بڈھے سے ایک منٹ بھی بات نہ کرنے دی۔ جالپا پوچھے گی تو ضرور کہ کیوں بھاگے تھے۔ صاف صاف کہہ دوں گا، اس وقت اور کر ہی کیا سکتا تھا، مگر ان تھوڑے دنوں کی تکلیف نے زندگی کا مسئلہ تو حل کر دیا۔ اب لطف سے زندگی کٹے گی۔ کوشش کر کے اسی طرف تبادلہ کرا لوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے رما کو خیال آیا کہ جالپا بھی میرے ساتھ یہاں رہے تو کیا ہرج ہے۔ مجھے باہر والوں سے ملنے کی ممانعت ہے۔ جالپا کے لیے رکاوٹ ہو سکتی ہے، لیکن اس وقت مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ کل اس کا تصفیہ کروں گا۔ دیبی دین بھی عجیب آدمی ہے پہلے تو کئی بار آیا، مگر آج اس نے بھی چپ سادھ لی۔ کم سے کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ آ کر پہرے والے کانسٹیبل کی معرفت مجھے جالپا کے آنے کی خبر دیتا۔ پھر میں دیکھتا کون جالپا کو نہیں آنے دیتا۔

رسوئیا تھالی لایا۔ گوشت ایک قسم کا تھا۔

رما تھالی دیکھتے ہی جھلا اٹھا۔ ان دنوں لذیذ کھانا دیکھ کر ہی اسے بھوک لگتی تھی۔ جب تک چار پانچ قسم کا گوشت نہ ہو، چٹنی اچار نہ ہو، اسے کھانے کی رغبت نہ ہوتی تھی۔ بگڑ کر بولا: ''کیا کھاؤں! تمہارا سر۔ تھالی اٹھا لے جاؤ۔''

رسوئیے نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''حضور اتنی جلد اور چیزیں کیسے بناتا۔ ابھی کل دو گھنٹے تو آئے ہوئے ہوئے ہیں؟''

''دو گھنٹے تمہارے لیے تھوڑے ہوتے ہیں؟''

''اب حضور سے کیا کہوں؟''

''مت بکو۔''

''حضور.....؟''

''مت بکوڈیم۔''

رسوئیے نے پھر کچھ نہ کہا۔ بوتل لایا۔ برف توڑ کر گلاس میں ڈالی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رما کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رسوئیے کو نوچ کھائے۔ اس کا مزاج ان دنوں بہت تیز ہو گیا تھا۔

شراب کا دور شروع ہوا تو رما کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ لال لال آنکھیں نکال کر بولا: ''چاہوں تو ابھی تمہارا کان پکڑ کر نکال دوں۔ ابھی اسی دم۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟''

اس کا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر رسوئیا چپکے سے سرک گیا۔ رما نے گلاس لیا اور دو چار لقمے کھا کر باہر صحن میں ٹہلنے لگا۔ دھن سوار تھی کیسے یہاں سے نکل جاؤں؟

یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا کہ تار کے باہر درختوں کی آڑ میں کوئی ہے۔ ہاں کوئی کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے۔ شاید اشارے سے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ رما ماتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں مفسدوں نے اس کی جان لینے کی تو نہیں ٹھانی ہے۔ یہ خدشہ اسے ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اسی خوف سے وہ رات کو بنگلے سے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ فقط جان کے اندیشے نے اسے اندر چلے جانے کی تحریک کی۔ اسی وقت ایک موٹر سڑک سے نکلی۔ اس کی روشنی میں رما نے دیکھا۔ وہ اندھیرا سایہ کسی عورت کا ہے۔ اس کی ساڑھی صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی طرف آ رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ کوئی مرد اس صورت میں میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جوں جوں پیچھے ہٹتا تھا، وہ سایہ اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا۔

یہاں تک کہ تار کے پاس آ کر اس نے کوئی چیز رما کی طرف پھینکی۔ رما چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا، مگر دیکھا تو صرف ایک لفافہ تھا۔ اس لیے کچھ تسکین ہوئی۔ وہ سایہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ رما نے لپک کر وہ لفافہ اٹھا لیا۔ خوف بھی تھا اور تعجب بھی۔ خوف م تھا، تعجب زیادہ۔ لفافہ کو جیب میں چھپائے وہ کمرے میں آیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کر لیے اور لفافہ کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ سرنامہ دیکھتے ہی اس کے دل پر پھریریاں سی اڑنے لگیں۔ تحریر جالپا کی تھی۔ فوراً لفافہ کھولا۔ ایک ہی سانس میں سارا خط پڑھ گیا اور ایک لمبی سانس لی۔ اسی سانس کے ساتھ تو ہمات کا وہ بوجھ، جس نے چھ ماہ سے اس کی روح کو دبا رکھا تھا۔ وہ سارا درد دل، جو اس کے خون حیات کو چوسے ڈالتا تھا۔ وہ ساری کمزوری، شرم اور خفت جیسے چھومنتر ہو گئی۔ اسے اتنی تقویت، اتنا غرور اور اپنے اوپر اتنا اعتماد کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی سنک یہ سوار ہوئی، ابھی چل کر داروغہ سے کہہ دوں مجھے اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن پھر خیال آیا بیان تو اب ہو ہی چکا۔ جتنی رسوائی ہونی تھی، ہو ہی چکی۔ اب گناہ کی لذت سے کیوں ہاتھ دھوؤں، مگر ان ظالموں نے مجھے کیسا دھوکہ دیا ہے۔ کیسا چکمہ دیا ہے اور ابھی تک مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اب بھی ان پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ اگر کسی بات پر اپنا بیان بدل دوں تو ناطقہ بند ہو جائے۔ یہی تو ہو گا۔ مجھے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ بلا سے، ان لوگوں کے منصوبے تو خاک میں مل جائیں گے۔

اس دغابازی کی سزا تو مل جائے گی۔ اور کچھ بھی نہ سہی۔ اتنی بدنامی سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ سب شرارت ضرور کریں گے، لیکن جھوٹا الزام لگانے کے سوا کر ہی کیا

سکتے ہیں۔ جب میرا یہاں رہنا ثابت ہی نہیں، تو مجھ پر الزام ہی کیا لگ سکتا ہے۔ سبھوں کے منہ میں کالک لگ جائے گی۔ ایک ایک کو اپنی جان کی خیر منانی پڑے گی۔ انہیں چکمہ دوں گا۔ کہہ دوں گا، اگر آج مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی تو میں شہادت دوں گا۔ اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہیں تو پیچھے سے کسی چھوٹے موٹے تھانہ میں نائب داروغہ بنا کر بھیج دیں اور وہاں سڑا کروں۔ لوں گا انسپکٹری اور کل دس بجے تک میرے پاس تقرری کا پروانہ آ جائے۔ وہ چلا کہ اسی وقت داروغہ سے کہے، لیکن پھر رک گیا۔ ایک بار جالپا سے ملنے کے لیے اس کی جان تڑپ رہی تھی۔ جالپا سے اتنی محبت، اتنی شیفتگی اور اتنی عقیدت کبھی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی غیبی طاقت ہے، جسے دیوتاؤں نے اس کی حفاظت کے لیے بھیجا ہو۔

دس بج گئے تھے۔ رماناتھ نے بجلی گل کر دی اور برآمدے میں آ کر زور سے کواڑ بند کر دیئے۔ جس سے پہلے والے سپاہی کو معلوم ہو۔ اندر سے کواڑ بند کر کے سو رہے ہیں۔ وہ اندھیرے برآمدے میں ایک منٹ تک کھڑا رہا۔ تب آہستہ سے اتر اار کانٹے دار کے پاس آ کر سوچنے لگا۔ اس پار کیسے جائے۔ شاید جالپا ابھی باغیچے میں ہو۔ دیبی دین ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہ باڑ اس کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اسے پھاند جانا غیر ممکن تھا۔ اس نے تاروں کے بیچ میں سے ہو کر نکل جانے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب کپڑے سمیٹ لیے اور کانٹوں کا بچاتے ہوئے سر اور کندھے کو تار کے بیچ میں ڈالا، مگر نہ جانے کیوں کپڑے پھنس گئے۔ ہاتھ سے کپڑوں کو چھڑانا چاہا تو آستین کانٹوں میں پھنس گئی۔ دھوتی بھی الجھی ہوئی تھی۔ بیچارہ بڑی مصیبت میں پڑا۔ نہ اس پار جا سکتا نہ اس پار۔ ذرا سی غلطی

ہوئی اور کانٹے اس کے جسم میں چبھ جائیں گے۔

مگر اس وقت اسے کپڑوں کی پروا نہ تھی۔ اس نے گردن اور آگے بڑھائی اور کپڑوں میں لمبا چیرا لگاتا ہوا اس پار نکل گیا۔ سارے کپڑے تار تار ہو گئے۔ پیٹھ میں بھی کھرونچے لگے، مگر اس وقت کوئی بندوق کا نشانہ باندھ کر بھی اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو وہ پیچھے نہ ہٹتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو اس نے وہیں پھینک دیا۔ گلے کی چادر پھٹ جانے پر بھی کام دے سکتی تھی۔ اسے اوڑھ لیا۔ دھوتی سمیٹ لی اور باغیچہ میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شاید رکھوالا کھٹک کھانے گیا ہوا تھا۔ اس نے دو تین بار آہستہ آہستہ جالپا کا نام پکارا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔ سمجھ گیا جالپا چلی گئی۔ وہ انہیں پیروں دیبی دین کے گھر کی طرف چلا۔ اسے مطلق خوف نہ تھا۔ بلا سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں بنگلے سے نکل آیا ہوں۔ پولیس میرا کر ہی کیا سکتی ہے۔ میں قیدی نہیں ہوں۔ کسی کی غلامی نہیں لکھائی۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ دیبی دین آدھ گھنٹہ پہلے لوٹا تھا اور کھانا کھانے جا رہا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رما نے چادر سر پر باندھ لی تھی اور دیبی دین کو ڈرانا چاہتا تھا۔

دیبی دین نے ہکلا کر پوچھا: ''کون ہے؟''

پھر رما ناتھ کو پہچان گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا: ''تم نے بھیا کھوب بھیس بنایا ہے۔ کپڑے کیا ہوئے؟''

''تار نکل رہا تھا۔ سب اس کے کانٹوں میں الجھ کر پھٹ گئے۔''

''رام رام، بدن میں تو کانٹے نہیں چبھے؟''

''کچھ نہیں۔ دو ایک کھرونچے لگے ہیں۔ میں بہت بچ کر نکلا۔''

''بہو کا خط تو مل گیا تھا؟''

''ہاں اسی وقت مل گیا تھا۔ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ تھیں۔''

''وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ جب سے تمہیں موٹر پر آتے دیکھا تبھی سے جانے جانے لگائے ہوئے تھیں۔''

''تم نے گھر میں کوئی خط لکھا تھا؟''

''میں نے کوئی خط وط نہیں لکھا بھیا۔ جب وہ آئیں تو مجھے خود اچنبھا ہوا کہ بغیر جانے بوجھے کیسے آ گئیں۔ پیچھے سے انہوں نے بتایا وہ شطرنج والا نقشہ انہی نے پراگ راج سے بھیجا تھا اور انعام بھی وہیں سے آیا تھا۔''

رما حیرت میں آ گیا۔ جالپا کی دانشمندی نے استعجاب میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی شکست کے خیال نے اسے کچھ ملول بھی کر دیا۔ یہاں بھی اس کی ہار ہوئی۔

بڑھیا اوپر گئی ہوئی تھی۔ دیبی دین نے زینے کے پاس جا کر کہا: ''ارے کیا کرتی ہو؟ بہو سے کہہ دے کہ ایک آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔''

یہ کہہ کر دیبی دین نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: ''چلو اب سرکار میں تمہاری پیشی ہوگی۔ بہت بھاگے تھے۔ بغیر وارنٹ کے پکڑے گئے۔''

رما کا ولولہ اور اشتیاق اڑا جاتا تھا۔ اس کی شرم اس کے سر پر سوار ہو جاتی تھی۔ جالپا کے سوالوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ جس خوف سے وہ بھاگا تھا، اس نے بالآخر اس کا پیچھا کر کے اسے مغلوب کر ہی دیا۔ وہ جالپا کے سامنے آنکھیں

بھی تو نہ سیدھی کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور زینہ کے پاس ٹھٹھک گیا۔

دیبی دین نے پوچھا: ''کیوں رک گئے؟''

رما نے سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا: ''چلو میں آتا ہوں۔''

بڑھیا نے اوپر ہی سے کہا: ''پوچھو کون آدمی ہے۔ کہاں سے آیا ہے؟''

دیبی دین نے دل لگی کی: ''کہتا ہے اب جو کچھ کہوں گا، بہو سے کہوں گا۔''

''کوئی چٹھی لایا ہے؟''

''نہیں۔''

سناٹا ہو گیا۔ دیبی دین نے ایک لمحہ کے بعد پوچھا: ''کہہ دوں لوٹ جائے؟''

جالپا زینہ پر آ کر بولی: ''کون آدمی ہے۔ پوچھتی تو ہوں؟''

''کہتا ہے بڑی دور سے آیا ہوں۔''

''ہے کہاں؟''

''یہ کیا کھڑا ہے؟''

''اچھا بلا لو۔''

رما چادر اوڑھے کچھ جھجکتا کچھ جھینپتا کچھ ڈرتا زینہ پر چڑھا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیبی دین وہاں نہ ہوتا تو وہ دو قدم آگے بڑھی ہوتی۔

جالپا کی آنکھوں میں کبھی اتنا سرور نہ تھا۔ جسم میں کبھی اتنی چستی نہ تھی۔ رخساروں پر کبھی اتنی چمک نہ تھی۔ سینہ میں کبھی اتنا ارتعاش نہ تھا۔ آج اس کی تمنا پوری ہوئی۔

ساری رات باتوں میں گزر گئی۔ دونوں ہی کو اپنی اپنی چھ مہینے کی داستان کہنی تھی۔ رما نے اپنا وقار جمانے کے لیے اپنی خستہ حالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ جالپا نے اپنی داستان میں اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہ کیا۔ وہ ڈرتی تھی انہیں رنج ہو گا، لیکن رما کو اسے رلانے میں مزا آ رہا تھا۔ وہ کیوں بھاگا۔ کس کے لیے بھاگا۔ یہ سارا قصہ اس نے دردناک آواز میں سنایا اور جالپا نے سسک سسک کر سنا۔ وہ اپنی لفاظی سے اس پر رعب جمانا چاہتا تھا۔ اب تک ہر ایک معاملے مین اس کی ہار ہوتی تھی۔ جو بات اسے محال معلوم ہوتی تھی، اسے جالپا نے چٹکیوں میں پورا کر دیا۔ شطرنج والے واقعہ کو وہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر سکتا تھا، لیکن وہاں بھی جالپا ہی غالب رہی۔ پھر اس کے لیے اس کے سوا اور کیا تدبیر رہ گئی تھی، کہ اپنی تکلیفوں کو رائی کا پربت بنا کر دکھائے۔

جالپا نے سسک کر کہا۔ تم نے یہ ساری کڑیاں جھیلیں اور مجھ کو ایک خط بھی نہ لکھا۔ کیوں لکھتے ہم سے ناتا ہی کیا تھا۔ منہ دیکھے کی محبت تھی۔ آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔

رما نے حیرت ناک لہجہ میں کہا۔ ''یہ بات نہیں جالپا۔ دل پر جو کچھ گزرتی تھی۔ دل ہی جانتا ہے لیکن لکھنے کا منہ بھی ہو۔ جب روپوش ہو کر گھر سے بھاگا تو اپنا قصہ غم کیا لکھنے بیٹھتا۔ میں نے تو سوچ لیا تھا۔ جب تک خوب روپے نہ کمالوں گا ایک لفظ بھی نہ لکھوں گا۔''

جالپا نے چشم پر آب میں طنز بھر کر کہا۔ ''ٹھیک ہی تھا۔ روپے آدمی سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ ہم تو روپے کے یار ہیں۔ تم چاہے چوری کرو۔ ڈاکہ ڈالو۔ جھوٹی گواہیاں دو۔ یا بھیک مانگو کسی طرح روپے لاؤ۔ تم نے تو میری عادت کو کتنا ٹھیک سمجھا ہے کہ واہ!''

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ جالپا یہ بات نہیں تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ ان پھٹے حالوں جاؤں گا کیسے۔ سچ کہتا ہوں مجھے سب سے زیادہ خوف تمہی سے لگتا تھا۔ سوچتا تھا۔ تم مجھے کتنا دغا باز مکار اور کپا دھا گا سمجھ رہی ہو گی۔ شاید میرے دل میں یہ خیال تھا کہ روپے کی تھیلی دیکھ کر تمہارا دل کچھ تو نرم ہو گا۔''

جالپا نے اسی ستم ظریفانہ لہجہ میں کہا۔ ''تو تمہارا وہ خیال تھا۔ میں شاید اس تھیلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ آج مجھے معلوم ہو گیا۔ تم مجھے کتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ ساری خطا میری ہے۔ اگر میں بھلی ہوتی، تو آج کا دن بھی کیوں آتا۔ جو آدمی تیس چالیس روپے مہینہ کا نوکر ہو، اس کی بیوی اگر دو چار روپے روز خرچ کرے، ہزار دو ہزار روپے کے زیور پہنے تو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تباہی کا سامان کر رہی ہے۔ اگر تم نے مجھے اتنا بندۂ زر سمجھا تو کوئی بے انصافی نہیں کی، مگر ایک بار جس آگ میں جل چکی، اس میں پھر نہ کودوں گی۔ ان چند مہینوں میں میں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ آخری دم تک کرتی رہوں گی۔ یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا یا گہنے کپڑے سے میں اوب گئی یا سیر تماشا سے مجھے نفرت ہو گئی۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں۔ اگر تم اپنی قوت بازو سے اپنی جانفشانی سے

انہیں پورا کر سکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم پولیس کے گواہ بن گئے ہو۔ مجھے اتنا رنج ہوا کہ دیبی دادا کو ساتھ لے کر تمہارے بنگلے تک گئی۔ اسی دن تم باہر چلے گئے تھے۔ میں اتنے آدمیوں کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتی۔ تمہیں بیان واپس لینا پڑے گا۔''

رما فکرمند ہو کر بولا: ''جب سے تمہارا خط ملا میں اسی معاملہ پر غور کر رہا ہوں، لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک بات کہہ کر مکر جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔''

''بیان تو بدلنا ہی پڑے گا۔''

''آخر کیسے؟''

''مشکل کیا ہے۔ جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میونسپلٹی تمہارے اوپر کوئی مقدمہ نہیں چلا سکتی تو پھر کس بات کا ڈر؟''

''ڈر نہ ہو۔ جھینپ بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس منہ سے ایک بات کہی، اسی منہ سے مکر جاؤں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ پھر مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ مجھ میں گلی گلی ٹھوکر کھانے کا بوتا نہیں ہے۔''

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی، انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے۔

رما نے پھر پہلو بدلا: ''اور کچھ میری شہادت پر ہی تو سارا فیصلہ نہیں ہوا جاتا۔ میں بدل بھی جاؤں تو پولیس نہایت آسانی سے کوئی دوسرا گواہ کھڑا کر دے گی۔ ملزموں کی جان تو کسی طرح نہیں بچ سکتی ہاں! میں مفت میں مارا جاؤں گا۔''

جالپا نے ترش ہو کر کہا: ''کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تمہیں اپنی روٹیوں کے لیے دوسروں کا گلا کاٹنا پڑے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے مزدوری کرنا، بھوکوں مر جانا منظور ہے، لیکن کسی کا برا چیت کر میں جنت کا راج بھی نہیں لے سکتی۔''

رما چڑ کر بولا: ''تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہاں قلی گیری کروں؟''

جالپا: ''نہیں میں یہ نہیں چاہتی، لیکن اگر قلی گیری بھی کرنی پڑے تو وہ خون چپڑی ہوئی روٹیاں کھانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

رما نے تحمل کے ساتھ کہا: ''جالپا تم مجھے جتنا کمینہ سمجھتی ہو، اتنا کمینہ میں نہیں ہوں۔ بری بات ہر ایک کو بری لگتی ہے۔ مجھے بھی اس بات کا رج ہے کہ میرے ہاتھوں اتنے آدمیوں کا خون ہو رہا ہے، لیکن حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ تم مجھے کیوں اس اونچائی پر چڑھانا چاہتی ہو، جہاں پر پہنچنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔''

جالپا نے پر ملامت تبسم کے ساتھ کہا: ''جس آدمی میں خون کرنے کی طاقت ہو، اس میں خون نہ کرنے کی طاقت کا نہ ہونا تعجب کی بات ہے۔ جس میں دوڑنے کی طاقت ہو، اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو،، اسے کون باور کرے گا۔ جب ہم کوئی ارادہ کر لیتے ہیں تو طاقت آپ ہی آپ آ جاتی ہے۔ تم یہ طے کر لو کہ تمہیں بیان بدلنا ہے۔ بس اور ساری باتیں آپ ہی آپ آ جائیں گی۔''

رما سر جھکائے سنتا رہا۔

جالپا نے پھر اسی رو سے کہا: ''اگر تمہیں یہ پاپ کی کھیتی کرنی ہے تو مجھے آج ہی

یہاں سے رخصت کر دو۔ میں آج منہ پر کالک لگا کر چلی جاؤں گی۔ پھر تمہیں دق کرنے نہ آؤں گی۔ تم زندگی کے مزے اٹھانا۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔''

رما کے دل پر کچھ چوٹ لگی۔ سر کھجا کر بولا: ''چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کسی طرح میری گلوخلاصی ہو جائے۔''

جالپا نے جواب دیا: ''تو پھر کرتے کیوں نہیں؟ اگر تمہیں کہتے شرم آتی ہے تو میں کہوں؟ یہی اچھا ہو گا، میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی اور تمہارے چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جالپا میں ان لوگوں کو سمجھا لوں گا۔''

جالپا نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا: ''تو وعدہ کرتے ہو، اپنا بیان بدل دو گے؟''

رما نے سرگرمی سے کہا: ''کہتا تو ہوں۔''

''میرے کہنے سے یا اپنے دل سے؟''

''تمہارے کہنے سے نہیں اپنے دل سے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے نفرت ہے۔ کچھ جھجک تھی وہ تم نے نکال دی۔''

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ کیسے پتا چلا کہ رما نے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے ادا کیسے ہو گئے؟ رتن پر کیا گزری؟ گوپی کیوں اتنی جلد بھاگ گیا۔ دونوں کچھ کچھ پڑھ رہے ہیں یا اسی طرح آوارہ پھر رہے ہیں؟ اماں تو بہت نہیں روتی ہیں؟ دادا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ ساری باتیں ہوئیں۔ پھر زندگی کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

جالپا نے کہا: ''چلو وہیں رتن سے تھوڑی زمین لے لیں اور کھیتی باڑی کریں؟''

رما نے کہا: ''اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہاں چائے کی دکان کھول لیں۔''

اس پر دونوں میں مباحثہ ہوا۔ آخر رما کو ہار ماننا پڑی۔ یہاں رہ کر وہ گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا۔ بھائیوں کی نگرانی نہ کر سکتا تھا اور ماں باپ کی کچھ خدمت نہ کر سکتا تھا۔ آخر گھر والوں کے ساتھ بھی تو اس کا کچھ فرض ہے۔ رما لاجواب ہو گیا۔

(40)

رما منہ اندھیرے بنگلہ پہنچا۔ کسی کو شبہ نہ ہوا۔

ناشتہ کر کے رما ناتھ نے خط صاف کیا اور داروغہ کے پاس پہنچا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ داروغہ نے پوچھا: ''خیریت تو ہے نوکروں نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟''

رما نے کھڑے کھڑے جواب دیا: ''نوکروں نے شرارت نہیں کی۔ ہاں آپ نے اور آپ کے افسروں اور ماتحتوں نے مجھے چرکا دیا ہے۔''

داروغہ نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا: ''آخر بات کیا ہے کچھ تو کہیے؟''

رما: ''بات یہی ہے کہ میں اس معاملے میں اب مطلق شہادت نہ دوں گا۔ آپ لوگوں نے مجھے دغا دی اور وارنٹ کی دھمکی دے کر مجھے شہادت پر مجبور کیا۔

اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے اوپر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ میں پولیس کی طرف سے شہادت نہیں دینا چاہتا۔ میں آج جج صاحب سے صاف کہہ دوں گا۔''

داروغہ نے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر کے کہا: ''آپ نے خود غبن تسلیم کیا تھا۔''

رما: ''وہ میزان کی غلطی تھی۔ غبن نہ تھا۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اس سے آپ کو کوئی بحث نہیں۔ میں شہادت نہ دوں گا۔ جن تاریخوں کا یہ وقوعہ ہے، ان تاریخوں میں الہ آباد میں تھا۔ میونسپل آفس میں میری حاضری درج رجسٹر ہے۔''

داروغہ نے اس معاملہ کو ہنسی میں اڑا کر کہا: ''اچھا صاحب پولیس نے آپ کو دھوکہ دیا، لیکن اس کا خاطر خواہ انعام دینے کو حاضر ہے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ موٹر پر بیٹھے سیر کرو گے۔ خفیہ پولیس کی کوئی جگہ مل گئی تو چین ہی چین ہے۔ سوچو سرکار کی نظروں میں کتنا رسوخ بڑھ گیا۔ یوں مارے مارے پھرتے۔ یوں کہو کہ تمہاری ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ اچھی کارگزاری دکھائی تو ایک دن رائے بہادر ہو جاؤ گے۔ تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہیے اور آپ الٹے خفا ہوتے ہیں۔''

رما پر اس کچھ اثر نہ ہوا۔ بولا: ''میں ایسی ترقی سے درگزرا۔ وہ آپ ہی کو مبارک ہو۔''

اتنے میں ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں آ پہنچے۔ رما کو دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے فرمایا: ''ہمارے بابو صاحب تو آج پہلے ہی تیار بیٹھے ہیں۔ بس آج کی کارگزاری پر وارا

نیارا ہے۔''

رما: ''جی ہاں آج وارا نیارا کر دوں گا۔ اتنے دنوں تک آپ لوگوں کے اشاروں پر چلا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلوں گا۔''

انسپکٹر نے داروغہ کا منہ دیکھا۔ داروغہ نے ڈپٹی کا منہ دیکھا۔ ''یہ لونڈا کیا کہتا ہے؟'' انسپکٹر صاحب نے استعجاب سے کہا۔ ''کیا معاملہ ہے۔ حلف سے کہتا ہوں آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔''

رما: ''میں نے اپنا بیان تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بے گناہوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔''

انسپکٹر نے اسے نگاہ ترحم سے دیکھ کر کہا: ''آپ بے گناہوں کا خون نہیں کر رہے ہیں۔ صاحب اپنی تقدیر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں ایسے موقعے بہت کم آدمیوں کو ملتے ہیں۔ آج کیا بات ہوئی کہ آپ خفا ہو گئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہوا داروغہ جی! اگر کسی نے آپ کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کی ہو تو اس کی گوشمالی کیجیے۔''

داروغہ: ''میں ابھی جا کر تحقیق کرتا ہوں۔''

رما: ''آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے فائدے کے لیے اپنے ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔''

ایک منٹ سناٹا رہا۔ کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ داروغہ کوئی دوسرا چکمہ سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کوئی دوسری ترغیب۔

دفعتاً ڈپٹی صاحب نے کہا: ''رما بابو یہ اچھا بات نہ ہوگا۔''

رما نے دلیری کے ساتھ کہا: ''آپ کے لیے نہ ہوگا، میرے لیے تو سب سے اچھی یہی بات ہے۔''

ڈپٹی: ''نہیں آپ کے لیے اس سے برا دوسرا بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ تم کو ایسا لیسن دے گا کہ تم زندگی بھر نہ بھولے گا۔ آپ کو وہی گواہی دینا ہوگا جو پہلے دے چکا ہے۔ اگر کچھ بھی گول مال کیا تو ہم تمہارے ساتھ دوسرا برتاؤ کرے گا۔ ایک رپورٹ میں تم یوں (کلائیوں کو نیچے اوپر رکھ کر) چلا جائے گا۔''

رما سہم اٹھا۔ اس تخویف نے اسے لرزہ براندام کر دیا۔ کہیں یہ سب کوئی جھوٹا مقدمہ چلا کر اسے پھنسا نہ دیں۔ تو کون اس کی فریاد سنے گا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب جو اخلاق اور مروت کے پتلے بنے ہوئے تھے، یک بارگی اتنے طیش میں آ جائیں گے۔ پھر بھی خودداری کے ساتھ بولا: ''آپ مجھ سے جبراً شہادت دلوائیں گے؟''

ڈپٹی نے پیر پٹک کر کہا: ''ہاں جبراً دلائے گا۔''

رما: ''واہ اچھی دل لگی ہے۔''

ڈپٹی: ''تم نے ابھی پولیس کی چال نہیں دیکھی ہے۔ ہم ابھی دو گواہ دے کر تم پر بغاوت کا کیس چلا سکتا ہے۔ بس چلا جائے گا سات سال کے لیے۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں گے۔ یہ چکنا چکنا منہ نہیں رہے گا۔''

رما جیل سے ڈرتا تھا۔ جیل کی زندگی کے خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیل ہی کے خوف سے اس نے یہ شہادت دینی منظور کی

تھی۔ وہی خوف اس وقت بھی اس کے دل میں رعشہ پیدا کرنے لگا۔ ڈپٹی نفسیات کا ماہر تھا۔ آسن کا پتا پا گیا۔ اسی لہجہ میں بولا: ''حلوہ پوری نہیں پائے گا، دھول ملا ہوا آٹا کا روٹی۔ گوبھی کے سڑے ہوئے پتوں کا ساگ کھانے کو پائے گا۔ چار مہینہ بھی کال کوٹھڑی میں گیا تو تم بچ نہیں سکتا۔ وہیں مر جائے گا۔ بات بات پر وارڈر گالی دے گا۔ جوتوں سے پیٹے گا۔ تم سمجھتا کیا ہے؟''

رما کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ اپنی کمزوری پر اسے اتنا ملال ہوا کہ رو پڑا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا: ''آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ بھیج دیجیے جیل۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ گلا تو چھوٹ جائے گا۔ جب آپ یہاں تک مجھے تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔''

اس کا دل ضعف کی اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ جب ذرا سی ہمدردی، ذرا سی شفقت، سینکڑوں دھمکیوں سے زیادہ کارگر ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی نبض پہچان لی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولے:

''حلف سے کہتا ہوں، آپ لوگ آدمی کو پہچانتے تو ہیں نہیں۔ لگتے ہیں رعب جمانے۔ اس قسم کی شہادت دینا ہر ایک ذی فہم آدم کو ناگوار گزرے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بابو کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم منحرف ہو جائیں گے۔ آپ لوگ اپنا کام کیجیے۔ بابو صاحب کی طرف سے مطمئن رہیے۔ میں ان کا ذمہ لیتا ہوں۔''

اس نے رما کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''آپ ڈپٹی صاحب کی گیدڑ بھبکیوں میں آ گئے۔ آیئے میرے ساتھ چلیے۔ ایسے ایسے ریکارڈ سناؤں گا طبیعت پھڑک اٹھے گی۔''

رما نے روٹھے ہوئے لڑکے کی طرح ہاتھ چھڑا کر کہا: ''مجھے دق نہ کیجیے۔ انسپکٹر صاحب! اب تو مجھے جیل خانے میں مرنا ہے۔''

انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ بھائی جان جیل خانے میں مریں آپ کے دشمن۔''

ڈپٹی نے تسمہ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہا۔ اس طرح بولا گویا رما سے کبھی جان پہچان نہیں: ''صاحب ہم تمہارے ساتھ سب طرح کا سلوک کرنے کو تیار ہے، لیکن جب تم ہمارا جڑ کھودو گے تو ہم بھی اپنی کاروائی کرے گا۔ ضرور سے کرے گا۔ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔''

اسی وقت سرکاری ایڈووکیٹ اور بیرسٹر موٹر سے اترے۔

(41)

رتن اپنے خطوں میں جالپا کو تشفی دیتی رہتی تھی، مگر اپنے بارے میں کچھ نہ لکھتی تھی۔ جو خود ہی مبتلائے غم ہو، اسے اپنی مصیبت کی کہانی کیا سنائے۔ جس نے روپوں کی کبھی کوئی حقیقت نہ سمجھی وہ اس ایک مہینہ میں روٹیوں کی محتاج ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اس کی زندگی پر عافیت نہ تھی، لیکن اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ مریل گھوڑے پر سوار ہو کر بھی سفر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سڑک اچھی ہو، نوکر چاکر اور کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو، گھوڑا بھی تیز ہو تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ رتن کی حالت